Tarseel, Vol.17 (ISSN: 0975-6655)
A Peer Reviewed Research Journal of Urdu
Listed in UGC-CARE
Directorate of Distance education,
University of Kashmir

غالب اور اقبال: چند نئے مباحث

ڈاکٹر عرفان عالم

تلخیص

غالبؔ اور اقبالؔ اردو کی شعری روایت کے دو اہم نام ہیں۔ دونوں شعرا اپنی منفرد فکر اور طرزِ اسلوب کے حوالے سے اپنی شناخت قائم کر چکے ہیں۔ بعض دانشورانِ ادب نے اقبال کو غالب کا معنوی فرزند تک قرار دیا ہے اور بعض کا ماننا یہ بھی ہے کہ غالب نے اقبال کے روپ میں نیا جنم لیا ہے۔ ان خیالات کے پس پشت ایک فلسفہ اور استدلالی فکر ہے اور یہ فکر و فلسفہ ان دونوں شعرا کی اپنے اپنی معاصر زندگی سے اکتاہٹ، ان کے اذہان میں موجزن جدت پسندی، فکر و خیال کی بلندی، حال اور مستقبل کا گہرا اور پختہ شعور اور ادبی شعریات پر مکمل گرفت سے تشکیل پاتے ہیں۔ اس مقالے میں راقم کی کوشش رہی ہے کہ اردو کے ان بلند پایہ تخلیق کاروں کے متون کی معاصر ثقافتی صورت حال کے تحت ایک نئی تعبیر پیش کی جائے اور یہ حقیقت واضح ہو سکے کہ دو ایک صدیاں گزر جانے کے باوجود بھی ان کی تخلیقات تر و تازگی کے احساس سے لبریز ہیں اور ہماری معاصر زندگی سے ہم آہنگ بھی۔ یہی وہ خوبیاں ہیں جو ادبی تخلیقات کو زماں و مکاں کی قید سے آزاد کر کے آفاقیت اور ابدیت کا درجہ عطا کرتی ہیں۔

کلیدی الفاظ: اسلامی تعلیمات، طلسمی دریا، گوشہ نشینی، فلسفہ حیات وکائنات

اردو شاعری کو غالب کے بعد جو عروج نصیب ہوا اُس کی ایک بڑی وجہ اقبال کی شاعری ہے۔ اقبال نے اپنی نظم ''مرزا غالب'' میں اسد اللہ خاں غالب کو یوں خراج تحسین پیش کیا ہے، کہ عقیدت کی تمام شعری کائنات ایک دم وہی پر رُک جاتی ہے۔ حالانکہ اقبال کا تصور شاعری غالب کے تصور شاعری سے بالکل جُدا گانہ ہے۔ اقبال کی شاعری اسلامی تعلیمات کی روح پر مبنی، جبکہ غالب کے یہاں کئی معنوں میں براہِ راست اس موضوع پر' کعبہ سے وہ کب کے الٹے پھر آئے ہیں'، صاف جھلکتا ہے۔ البتہ تصوف کے موضوع کے حوالے سے غالب کا جواب نہیں۔ جہاں تک اقبال کا سوال ہے وہ مقصدیت کے بہت بڑے ترجمان تھے، جبکہ غالب شاعری کو شعری روح کا ہی جامعہ پہناتے نظر آ رہے ہیں۔ شاعری کس طرح کی ہونی چاہئے؟ اس حوالے سے اقبال کا خیال اُن کے ایک انگریزی مضمون جس کا عنوان"our Prohets criticism on contemporary Arabian Poetry" جو کہ لکھنو سے شائع ہوتھا اور جس کا ترجمہ اردو میں مولانا ظفر علی خان نے کیا، سے ان کا نظریہ صاف دیکھائی دیتا ہے۔ اقبال سے پہلے حالی ''مرثیہ غالب'' لکھ کر یہ کہہ گئے تھے۔

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا
شہر میں اک چراغ تھا نا نہ رہا
ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے
ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں!
غالبِ نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسماں سے کیا نسبت

حالانکہ حیرت یہاں یہ ہوتی ہے کہ حالی نے جس قدر غالب کی تخیل کی وسعتوں کا ذکر اپنے اس مرثیے میں پیش کیا ہے، اس طرح کا انداز اُنہوں نے غالب کی سوانح حیات ''یادگارِ غالب'' میں واشگاف انداز میں نہیں اپنایا۔ اس کے برعکس سرسید کی سوانح ''حیاتِ جاوید'' قدرے مختلف ہے۔ البتہ اس سلسلے میں نواب مصطفٰے خان شیفہ نے اپنے تذکرہ" گلشنِ بے خار'' میں غالب کے تخیل کی بلندیوں کی طرف جو توجہ دلائی ہے ان کے بعد اس کا ذکر اقبال کی اس نظم میں ملتا ہے۔ لیکن نظم کی صورت میں حالی کے ''مرثیہ غالب'' کے بعد یہ نظم کسی بڑے شاعر کا پہلا خراج عقیدت ہے، اگر یوں کہے تو غلط نہ ہوگا کہ یہ نظم جو غالب کے فکر وفن کو نئی معنویت کے ساتھ پیش کرتی ہے کسی بڑے شاعر کا پہلا خراج عقیدت ہیں، کیونکہ حالی ایک بڑے نقاد صحیح لیکن بڑے شاعر وہ بھی اُنہیں اقبال کے مدمقابل رکھنا صحیح نہیں۔ اقبال کی نظم

"مرزا غالب" ستمبر 1910ء میں "مخزن" میں شائع ہوئی۔ قارئین کے لئے نظم کا متن کلیات اقبال سے لیا گیا ہے:

فکرِ انسان پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا
تھا سراپا روح تو، بزمِ سخن پیکر ترا
زیبِ محفل بھی رہا، محفل سے پنہاں بھی رہا
دید تیری آنکھ کو اس حسن کی منظور ہے
بن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستور ہے
محفلِ ہستی تری بربط سے ہے سرمایہ دار
جس طرح ندی کے نغموں سے سکوتِ کوہسار
تیری فردوسِ تخیل سے ہے قدرت کی بہار
تیری کشتِ فکر سے اگتے ہیں عالم سبزہ زار
زندگی مضمر ہے تیری تحریر میں
تابِ گویائی سے جنبش ہے لبِ تصویر میں
نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر
محو حیرت ہے ثریا رفعتِ پرواز پر
شاہدِ مضموں تصدق ہے تیرے انداز پر
خندہ زن ہے غنچہ دلی، گلِ شیراز پر
آہ!! تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے
لطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں
ہو تخیل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشیں
ہائے!! اب کیا ہوگئی ہندوستان کی سر زمیں
آہ!! اے نظارہ آموزِ نگاہِ نکتہ بیں

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے
شمع یہ سودائیِ دل سوزیِ پروانہ ہے
اے جہاں آباد! اے گہوارہ علم و ہنر
ہیں سراپا نالہ خاموش تیرے بام و در
ذرے ذرے میں تیرے، خوابیدہ ہیں شمس و قمر
یوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گہر
دفن تجھ میں کوئی فخرِ روزگار ایسا بھی ہے؟
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے؟

اس نظم میں پانچ بند تھے، بانگِ درا کی ترتیب کے وقت دوسرا بند حذف کر دیا گیا اور نیا بند لکھ کر شامل کیا گیا۔ حذف شدہ بند کے اشعار قابلِ ذکر ہیں کیونکہ اقبال نے دیوانِ غالب کے پہلے شعر سے تمہید باندھی تھی۔

معجز کلکِ تصور ہے، یا دیواں ہے یہ
یا کوئی تفسیرِ رمزِ فطرتِ انساں ہے یہ
نازشِ موسیٰ کلامی ہائے ہندوستاں ہے یہ
نورِ معنیٰ سے دل افروز سخنداں ہے یہ
نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن، ہر پیکرِ تصویر کا

عبدالرحمٰن بجنوری نے 1916ء میں اپنے مشہور تاثراتی مضموں میں یہ لکھا تھا کہ "ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، مقدس وید اور دیوانِ غالب''، جب اُنہیں بابائے اردو مولوی عبدالحق نے دیوانِ غالب پر مبسوط مقالہ لکھنے کی ذمہ داری سونپی تھی۔ حالانکہ اس سے کافی پہلے اقبال غالب کے دیوان کے بارے میں یہ کہہ چُکے تھے کہ یہ ایک معجزاتی کتاب ہے اور اس کے کلام سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ کتاب مانند کلامِ موسیٰؑ کلیم اللہ ہے۔ کیونکہ اقبال نے غالب کے تفکر و تخیل کو اُن اونچائیوں پر پایا جہاں تک کسی عام شخص کی بینائی پہنچ نہیں سکتی ہے، یہ یقیناً غیب سے آئے ہوئے خیالات ہی ہے۔ گوپی چند نارنگ اپنی مشہور و معروف کتاب ''غالب معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات'' میں غالب کی معنی آفرینی کے حوالے سے آغاز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''غالب کا کلام جامِ جہاں نما ہے۔غالب کے اشعار میں نہایت دقیق، دوررس اور پیچ در پیچ معانی کی ایک حیرت زا اور عمیق دنیا آباد ملتی ہے۔غالب کے بارے میں سب سے بڑا سوال جس کا جواب نہیں وہ یہ ہے کہ وہ کیا چیز ہے جو کوندے کی طرح لپکتی ہے اور شبستانِ معنی کو روشن کرتی چلی جاتی ہے۔اس طور کہ پڑنے والا دم بخود رہ جاتا ہے۔قاری تحلیل کرنا چاہتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ایک جمالیاتی وارِدات سے گُزرتا ہے جس کا بیان آسان نہیں۔اس کی حسن کاری میں وہ خاص کشش ہے کہ کوئی کمی نہیں آتی۔۔۔۔۔نیز اس کے نیرنگِ نظر اور فکری طلسمات کے بارے میں جتنا سوچئے اتنے نئے در وا ہو جاتے ہیں۔یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر عقیدے، ہر مزاج، ہر وضع کے شخص کے لیے اس کی پسند کا کچھ نہ کچھ مال یہاں ضرور مل جاتا ہے۔اس میں کچھ مقناطیست ایسی ہے کہ ہر کرشمہ دامنِ دل کو کھینچتا ہے۔۔۔''1

اقبال جو کہ خود خودی کے سوز و دروں میں مست تھا اور وہ ہر بات کو یہاں تک فن کو بھی خالص شرعی پیمانوں کے تحت ہی تولتا تھا پھر ایسی کیا بات ہوئی کہ غالب کے فنی کمالات کے سامنے اُس کا سوز دروں ٹھنڈا پڑ گیا اور اسے لیلیٰ میں وہی لیلائی نظر آئی جس کا جنون اقبال کے اُس عہد تک آتے آتے اور بڑھ گیا اور اس جنون کا بیان اُن بیانات میں بھی ملتا ہے جہاں اقبال زمیں کی روشنیوں سے اُٹھ کر افلاک کے ظلماتوں میں نور ڈھونڈھنے نکلتے ہیں۔

غالب اور اقبال دونوں کو اپنے فارسی کلام پر ناز تھا۔غالب نے اپنے اردو کلام کو خود ہی ''برگ از نخلستانِ فرہنگِ من" کہا اور دعویٰ کیا کہ یہ بے رنگ اردو شاعری کیا دیکھتے ہو، یہ تمھارے لیے باعثِ فخر ہوگی، میرے لیے تو موجبِ ننگ ہے۔دیکھنا ہے تو میرا فارسی کلام دیکھو۔

غالب کی طرح اقبال کا بھی تمام تر شعری سرمایہ اردو اور فارسی زبانوں میں ہی ہے اور غالب کی طرح ہی اقبال کو بھی اپنے فارسی کلام پر ناز تھا، کہتے ہیں کہ اردو زبان میں وہ پختگی نہیں ہے کہ وہ فارسی زبان کی شیرینی اور وسعت کا مقابلہ کر سکیں۔یہاں تک کہ اقبال نے اپنے ایک ہم عصر سے کہا ''اشعار مجھ پر فارسی زبان میں الہام ہوتے ہیں اور میری روح کی زبان فارسی ہی ہے۔'' لیکن عوامی سطح پر اقبال کو شہرت اردو شاعری کی وجہ سے ہوئی، چونکہ جیسا کہ اُنہوں نے خود کہا کہ فارسی میرے روح کی اور الہامی زبان ہے اس لئے اُنہوں نے اپنی شاعری کا بڑا کارنامہ 1936ء میں شائع شدہ تقریباً دو ہزار اشعار پر مشتمل مشہور و معروف مثنوی ''جاوید نامہ'' کے لئے فارسی سے بہتر اور کوئی زبان نہیں پائی، اس مثنوی کو اپنی زندگی کا حاصل کلام سمجھتے ہوئے اور اس کی بڑائی پر فخر کرتے ہوئے اقبال فرماتے ہیں:

آنچہ گفتم از جہانے دیگر است
این کتاب از آسمانے دیگر است

اس بات پر فخر کرتے ہوئے کہ یہ ڈرامائی نظم دراصل مشرقی ''ڈیوئین کومیڈی'' ہے، ایک خط میں لکھتے ہیں ''جہاں تک میرا علم ہے کسی زبان میں اس قسم کی کتاب اس سے پہلے نہیں لکھی گئی۔'''' جاوید نامہ'' اقبال کا ایک خیالی سفر نامہ ہے، جہاں سے اقبال مولانا رومی کے ہمراہ سیاروں کی سیر کرتے ہوئے کئی ایک معروف رواحوں سے ملاقات کرتے ہیں، بہت سے افلاک کی سیر کرتے کرتے فلک مشتری پر وہ تین ایسے روحوں سے ملتے ہیں جن میں منصور حلاج اور قرۃ العین طاہرہ کے ساتھ ساتھ مرزا غالب بھی شامل ہیں، ان روحوں کو بہشت پیش کیا گیا تھا لیکن انہوں نے اسے قبول نہ کیا۔ مرزا غالب کی شاعری کے متعلق ان کی روح سے ادبی اور مذہبی قسم کے سوالات پوچھے جاتے ہیں۔2

غالب اور اقبال دونوں کے کلام میں لفظ بولتے نظر آتے ہیں، دونوں نے مختصر لفظوں میں معنوں کے دفتر کھولیں ہیں، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ لفظوں میں گنجینہ معنی وا کرنے کے طریقے اِنہوں نے فارسی سے سیکھے، وہیں فارسی لفظیات سے ایسے پیکر تراشے ہیں کہ اردو زبان میں لفظ آب رواں کی مانند نہ صرف کھل اُٹھتے ہیں بلکہ اس پرواز سے سوزِ دروں پیدا کرتے ہیں۔ یوسف حسین خان 'غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات' میں لکھتے ہیں 'غالب اور اقبال دونوں کے کلام کی قدر مشترک جذبے کی شدت، تخیل وفکر کی بلندی اور وجدانی کیفیت ہے۔ ان سب عناصر کے امتزاج سے ان کا اسلوبِ بیان وجود میں آیا، یہ اُن کے کلام کی محض آرائش کا وسیلہ نہیں بلکہ ان کی فنی تخلیق کا جزو لاینفک ہے۔'(ص13) کیونکہ ان کے کلام میں رنگارنگی،، فصاحت، بلاغت، روانی اور تہہ در تہہ جادوئی معنی، ارتعاش، کیا بیدل کے کلام کی عظمت اس بات کی معترف نہیں ہے۔ دونوں غالب اور اقبال نے بیدل کو اپنا استادِ فن مانا ہے۔

بیدل فارسی زبان کے مسلم الثبوت اُستاد تھے، ان کے فکر وفن کی عظمتوں کو ہر کس و ناکس نے تسلیم کیا ہے۔ بیدل کے تخیل کی بلندی، فکر کی گیرائی و گہرائی، بندشِ الفاظ سے معنوں کا جو طلسمی دریا موجزن ہوتا ہے اُس کی مثال خصوصاً اردو شاعری میں ملنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ غالب چونکہ اردو شاعری میں ایک الگ ہی دنیا آباد کرنے جا رہے تھے، اس لئے انہوں نے ولی اور میر کی تتبع کرنے کے بجائے بیدل کے انداز میں طلاطم کرنے کی کوشش کی، غالب نے شاعری میں مرزا بیدل کو ہی اپنا معنوی استاد منتخب کیا۔ غالب کی شاعری ہو یا پھر اقبال کی دونوں کے کلام میں جیسے کلامِ بیدل الہام کی صورت بن کر ان کے شعورِ تخلیق میں اس طرح جزب ہوئی ہو جیسے سابق مدیرِ ''مخزن'' جناب شیخ عبدالقادر کے کہ غالب اقبال کی صورت میں پیدا ہوئے ہیں۔ اگر میں بھی تناسخ کا قائل ہوتا تو یہ کہتا

جیسے بیدل عدم میں بے دل رہا اور دو صدیوں میں اپنے دل کو کبھی دلی کے غالب میں اور بعد ازاں پنجاب کے اقبال میں پیوست کر کے اپنے تخیل، فکر، وجدان، نئے پیکروں، تراکیب اور معجزہ ہنر کو کلامِ غالب اور اقبال کے ذریعے طوطئ ہند بن کر اُسی مخصوص آہنگ میں نغمگی کے راگ بیکھرتا رہا:

قمری کفِ خاکستر وبلبل قفسِ رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

حد درجہ ابہام کے باوجود غالب کا یہ شعر اقبال کے اندر طلاطم پیدا کر دیتا ہے کہ ''جاوید نامہ'' میں فلک مشتری پر غالب سے ملاقات کے دوران 'زندہ رود' اسی شعر کے متعلق غالب سے استفسار کر رہے ہیں لیکن غالب 'من ندیدم چہرہ معنی ہنوز' کہہ کر یہ کہنے کی کوشش میں ہیں کہ یہ کام شعر و شاعری سے پرے ہیں۔ طرزِ بیدل خصوصاً غالب اور غالباً اقبال نہ اپنا سکے پھر بھی فکر و فن کے لامکاں تک بیدل نے غالب اور اقبال کی رہنمائی کی۔ آئے کلامِ اقبال سے لی گئی ایک غزل کا بیدل کی غزل سے موازنہ کرتے ہیں، یوں لگتا ہے جیسے من و عن بیدل کی ایک فارسی غزل کا اردو ترجمہ ہے۔

کلامِ اقبال

کیا رفعت کی لذّت سے نہ دل کو آشنا تو نے
گزاری عمر پستی میں مثال نقشِ پا تو نے
فدا کرتا رہا دل کو حسینوں کی ادا ?ں پر
مگر دیکھی نہ اس آئینے میں اپنی ادا تو نے
سراپا نالہ بیدادِ سوزِ زندگی ہو جا
سپند آسا گرہ میں باندھ رکھی ہے صدا تو نے
زمیں کیا آسماں بھی تیری کج بینی پہ روتا ہے
غضب ہے سطرِ قرآں کو چلیپا کر دیا تو نے!
کنوئیں میں تو نے یوسف کو جو دیکھا بھی تو کیا دیکھا
ارے غافل! جو مطلق تھا مقیّد کر دیا تو نے

کلامِ بیدل

اے اہل آوارہ فرصت را چہ رسوا کردہ ای
نوحہ کن در یاد امروزی کہ فردا کردہ ای
حسن مطلق رامقید تا کجا خواہی شناخت
آہ ازاں یوسف کہ در چاہش تماشا کردہ ای
پشت وروی صفحہ ادراک تست اسلام و کفر
سطرِ قرآں را ز کج بینی چلیپا کردہ ای
صورتِ آئینہ ای، از حالِ خود غافل مباش
گرہمہ در خانہ باشی رو بصحرا کردہ ای
ساغرت بر سنگ زن تا نالہ ای گردد بلند
نشہ ہنگامہ پستی دوبالا کردہ ای
ہر کجا عشاق دامانِ مژہ افشردہ اند
قطرہ را دیدہ ای گر سیرِ دریا کردہ ای

پہلے شعر میں اقبال رفعت کی لذتوں سے دل کو آشنا کر رہے ہیں مضموں بیدل کے پہلے ہی شعر سے لیا ہے، جس میں بیدل آوارہ تمنا?ں سے شکوہ سنج ہے کہ کہ تم نے فرصت کے ان لمحات میں خود کو رسوا کیا، کاش تو اس بات کی نوحہ خوانی کرتا کہ میں نے کل کے لئے کیا تیاری کر کے رکھی ہے۔ دوسرے شعر میں اقبال اس بات پر نوحہ خواں کہ دوسروں کے حسن کی لذتوں میں تم اپنے اصلی حسن سے بے بہرہ رہے، یہ شعر بیدل کی مذکورہ غزل کے تیسرے شعر کا ترجمہ ہے جس میں بیدل اس بات سے متفکر ہے کہ اے انسان تو خود آئینہ بن گیا ہے جہاں تمیں دوسروں کی خوبصورتی نظر آتی ہے لیکن اپنی خوبصورتی صحرا کی مانند رائیگاں ہوگئی ہے۔ ایک اور شعر میں اقبال نے بیدل کے شعر کا ہو بہ ہو ترجمہ کیا ہے جس میں اس بات پر احتجاج شاعر نے درج کیا ہے کہ اے قرآن پڑھنے والے تو کیوں اس کو سمجھنے سے قاصر ہے، تمہاری غلط تفہیم سے زمیں و آسماں رو رہا ہے۔ ایک اور شعر میں پھر ایک بار بیدل کا ہی مضموں لیا گیا ہے جس میں یوسف کنعان کے کنوئیں کے قصے کے حوالے سے بات چھیڑی ہے کہ جو سبق اس قصے سے لینا تھا وہ ہم سبق ہم اس سے نہیں لے پائے کہ کس طرح ایک بے کس کو اللہ تعالیٰ نے شہر یار بنا ڈالا۔

اسی طرح آپ کو کلام غالب میں بھی جگہ جگہ طرز بیدل میں ریختہ کی قیامت نظر آئے گی، کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غالب فارسی میں سوچتے ہوں اور پھر اس فارسی سوچ کو اردو میں تبدیل کر کے صفحہ قرطاس پر اتار رہے ہوں، کیونکہ ولی سے میر تک حتا کہ ناسخ کی زبان دانی سے آتشِ مرصع ساز تک اس طرح کی ترکیبیں، پیکر، بندشیں، محاورے، کہاوتیں اور لفظوں کی تراش وخراش کہیں نہیں ملتی اور جب نظر غالب پر جاتی ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے غالب بیدل کے وارث ہوں اور پھر اس جاگیر کو اقبال کے حوالے کر دیا گیا ہو۔

> ''غالب اور بیدل کے باہمی رشتے کے بارے میں زیادہ صحیح رائے یہ ہوگی کہ غالب نے پچیس سال کی عمر تک بیدل کو اپنا اُوڑھنا بچھونا بنائے رکھا۔۔۔۔۔ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ انسان کی شخصیت اور طرزِ فکر کی تشکیل عمر کے ابتدائی حصے ہی میں ہوتی ہے۔ چنانچہ غالب کو جو کچھ ذہنی اعتبار سے بننا تھا پچیس سال کی عمر تک بیدل کے زیر سایہ بن چکے تھے۔۔۔۔۔ بنیادی طور سے وہ (غالب) بیدل ہی کے ساختہ پرداختہ رہے۔ غالب کی شاعری کا فلسفیانہ اور فکر انگیز لہجہ بھی اس بات کی تصدیق کرتا ہے۔ یہ لہجہ ان مبہم استعاروں اور پیچیدہ بندشوں میں لپٹا ہوا ہے جو اٹھارویں صدی کے اوائل ہی میں وضع کی گئی تھی۔۔۔۔۔۔ چنانچہ مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ غالب کے تصوف آمیز افکار، ان کا فلسفیانہ تجسس اور ان کے زمان ومکان کے باہر اُڑان بیدل کے اثرات کا نتیجہ ہے۔''3

جہاں تک راقم نے سمجھنے کی کوشش کی ہے کہ غالب نے بیدل سے تصوّف کا فلسفہ تو سمجھا، لیکن تصوف کے اس سفر میں غالب نے بیدل کی رہنمائی قبول نہیں کی، ہمیں یہاں پر غالب کے اس طریقہ تصوف سے انکار کو اس بات کے آئینے میں نہیں دیکھنا چاہئے کہ کہیں غالب نے بیدل کے تصوف کو بھی ''طرزِ قیامت'' کی بنیاد پر دیکھا اور اس سے باہر نکل آئے، بلکہ غالب نے گوشہ نشینی کے بجائے وہ اُڑان بھر لی جہاں سے فکر اُن حدوں کو چھو آئی کہ عرش سے پرے لامکاں پر مکاں بنانے کے خواب بُننے لگے۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ غالب بیدل کے تصوف کے متوالے نہیں، بلکہ اس کی زبان وبیان، لہجہ، معنی آفرینی اور اسلوب کی تہ داری سے اپنی شعری کائنات کی ایک نئی کہکشاں دریافت کی۔ فرماتے ہیں:

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا
بخشی ہے جلوہ گل ذوق تماشا غالب
چشم کو چاہئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

یہی وجہ ہے کہ جب غالب نے اپنی شاعری کی شروعات کی تو اُنہیں تصویر میں طرح طرح کے پیکر نظر آنے لگے یوں لفظ کردار بنتے گئے جو اس کے پیچھے بھاگنے لگے اور اس نے لفظوں سے قدرے مختلف کام لیا اور یہ کام اُس عہد میں ایک دم انوکھا اور سمجھ سے باہر نظر آنے لگا، ایسی صورتحال میں ایسا کلام جو بلکل ہی غیر مانوس اور ایک طرح سے معیوب معلوم ہوتا ہو۔ جب غالب کو مُدت بعد دربار تک رسائی نصیب ہوئی اور اپنی سخن کو سخن کرنے موقع ملا، لیکن اُسے اپنی کاغذی تحریر کا لُوہا منوانے کے لئے جوئے شیر لانے کی ضرورت پڑی، غالب شاعری میں کسی نئی ہیت کا تجربہ لے کر نہیں آئے تھے، بلکہ خطا یہ تھی کہ اُن کا اسلوب نگارش ذرہ سا ہٹ کے تھا، لیکن اگر حقیقتاً اس اسلوب نگارش کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو آج کے عہد میں اسے اعلیٰ ادب کے زمرے میں رکھا جائے گا:

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا
کسی کو دے کے دل کوئی نوائے سنج فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زبان کیوں ہو

اقبال کے عہد میں غالب کی دھوم تھی کیونکہ زبان و بیان اور فکری اور ذہنی ارتقائکے حوالے سے یہ غالب کو سمجھنے کا ارتقائی عہد تھا۔ اردو زبان عوامی زبان تھی اور اس زبان سے وابستہ ادب عوامی ادب تھا، اس دور میں غالب کی خوب پذیرائی ہوئی۔ چونکہ غالب کی طرح اقبال کا مطمح نظر بھی ایک وسیع فلسفہ حیات و کائنات تھا۔ اگر چہ غالب کا دائرہ فکر تصوف کے رنگوں سے مزیں تھا، لیکن اقبال کا دائرہ فکر تصوف کے ان رنگوں سے زیادہ پھیلا ہوا تھا، ان کا موضوع انسان اور انسانی زندگی کے ساتھ ساتھ مذہب کی ترویج جو کہ تصوف سے ایک دم الگ ہی موضوع ہے، ایسا موضوع شاید پہلی بار اردو شاعری میں رائج ہو رہا تھا، حالانکہ میتھو آرنالڈ کے مطابق ہماری شاعری آدھے سے زیادی مذہبی ہے، ایسے میں اقبال کیونکر پیچھے رہتے۔ غالب اور اقبال دونوں نے اپنے اپنے انداز سے کائنات اور حقیقت کائنات کے رشتے کو ارضی سطح سے لے کر عرشی سطح تک سمجھنے کی کوشش کی، جہاں سے زندگی کی باقی مانند حقائق بھی وا ہونے لگے، اب اشعار فکر و نظر کی ایسی تجربہ گاہ سے گُزرنے لگے کہ تجربات کا وسیع و عریض دفتر کھلنے لگا۔ ایک نئے ہی موضوع نے جنم لیا اور یوں ادب میں جدید مسائل کیا بلکہ زندگی ہی سمانے لگی۔

غالب اور اقبال کے اس نئے اور منفرد شعور کو سمجھنے کے لئے یہ لازمی بن جاتا ہے کہ ہم انہیں اُن کے عہد کے حوالے سے جاننے کی کوشش کریں، دونوں شعرا کے حیاتِ جاوداں کا اُن کے عہد کے حوالے سے کا بغائر مطالعہ کرنا اس لئے بھی ضروری بن جاتا ہے تا کہ اصل موضوع کی طرف جاتے جاتے اصل موضوع کی اور جانے کے مآخذات سے واقفیت حاصل ہو جائے۔ شروعات زمانی لحاظ سے غالب کے زمانے سے کرتے ہیں اور پھر اقبال کی دور کی اور بڑھنے کی کوشش کریں گے۔

غالب کا دور حیات بے شمار عناصر کی کشمکش کا زمانہ تھا اور وہ اُس خاندان سے تعلق رکھتے تھے، جس کے رشتے گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ بھی تھے اور آنے والے وقت کے ساتھ بھی اور جس شہر سے وہ تعلق رکھتے تھے، وہ سیاسی کشمکش کے مرکز میں تھا۔ کسی بھی معاملے کی شروعات کہیں سے بھی ہو، اُس کا حل یا اختتام دلی میں ہی ہوتا تھا۔ چنانچہ غالب جیسے شاعر کے سوانحی حقائق میں اس عہد کے خلفشار کی دلیل اگر مکمل طور سے دکھائی دیتی ہے، تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ یہی اُن کی خوش قسمتی بھی تھی اور بد قسمتی بھی۔ وہ پُرانی روایات کی آغوش میں نہ صرف پلے بڑھے تھے، بلکہ انہیں اس کے ساتھ اس حد تک محبت اور وابستگی تھی کہ تمام عمر خلعت، خطاب، وظیفہ و پنشن کی تمنا اور پھر اس پر فخر کے ساتھ جیتے رہے۔ مگر مشاہدات، تجربات و حادثات نے ان کے ذہن کو نئی سمتوں میں بھی سفر کرانا سکھایا تھا۔(5)

غالب کا عہد ایک طرح کی کشمکش کا عہد تھا۔ تاریخ مکمل طور پر دوراہے پر کھڑی تھی یا تو ایک انسان کو تقلید کا فیصلہ کرنا تھا یا پھر تجدید کا اور ایک انسان کو یہ بھی ذہن میں رکھنا تھا کہ تمام دنیا بھی بدل رہی ہے۔ یورپ تو پہلے ہی بدل چکا تھا اور باقی دنیا تبدیلی کی طرف جا رہی تھی۔ کارل مارکس اور فریڈرک اینگلیز نے اشتراکیت کے نئے نظریے دینے شروع کئے تھے جسے تقریباً نصف دنیا قبول کرنے والی تھی، اسی زمانے میں جہاں جرمنی سے کارل مارکس باہر نکل چکا تھا مگر جرمنی کے اندر نیا مفکر گوئٹے اپنی ''فاوسٹ'' لکھ رہا تھا اور اسی زمانے میں سگمنڈ فرائڈ بھی انسانی نفسیات کے تہہ خانوں میں اتر رہا تھا۔ مسلمانوں کی تاریخ میں بھی کچھ آزاد خیال یا روشن خیال، تجدد پسند انقلابی سامنے آ رہے تھے۔ جمال الدین افغانی اور عبدالوہاب نجدی نے اسلام میں تحریک تجدد اور تحریک احیاء کی بنیاد ڈالی۔

مختصراً غالب کا زمانہ تبدیلیوں کا زمانہ تھا اور یہ تبدیلیاں ہمہ گیر تھیں، اُنہوں نے ہر مکتب فکر فلسفہ، سماجیات، اقتصادیات، ادبیات، عمرانیات، مذہب غرض کہ ہر مکتب فکر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور ہر مکتب فکر کے لئے عظیم مفکر پیدا ہو چکے تھے۔ اس طرح انیسویں صدی ایک نئی صدی تھی ہی مگر وہ پچھلی تمام صدیوں سے قدرے مختلف بھی تھی، جس میں اچانک تغیر ہی تغیر پیدا ہو چکا تھا۔ اسی صدی میں ہندوستان میں کچھ مفکر اور روشن خیال بھی پیدا ہو چکے تھے، جن میں راجہ رام موہن رائے اور سر سید احمد خان بڑے نام ہیں۔ جنہوں نے اپنے اپنے مذاہب سے وابستہ افراد کو نئی صدی سے آنے والی تازہ ہوا کا فائدہ اُٹھانے کو کہا۔ غالب نے بھی یہ ہوا محسوس کی اور چونکہ وہ ایک جدید ذہن رکھتے تھے، اس لئے انہوں نے نہ صرف جدت کو محسوس کیا، بلکہ اُسے مستفید ہونے کی بھی لوگوں کو تلقین کی۔ ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں:

> "غالب کے دور تک آتے آتے ایک طرف تو یورپ عہد ظلمت سے نکل کر روشن خیالی کے دور میں داخل ہو چکا تھا، تو دوسری طرف ایشیائے اس کے تجارتی تعلق کی اجارہ داری ہندوستان سے ہی نہیں، ترک ایرانیوں کے ہاتھ سے بھی نکل چکی تھی، جو ہند ایران تہذیب کی بنیاد تھی۔ اب ان اہلِ حرفہ کی اہمیت نہ تھی جو ڈھاکے کی ململ بُنتے اور بیرون ملک برآمد

کرتے تھے۔اب انسان اپنے ہاتھ میں 'عقل اور ارتقاء' کے نئے ہتھیاروں کے ذریعے لا
محدود امکانات کو ختم کرنے کے خواب دیکھنے لگا۔''5

شاید غالب نے 1837 کے سال کے حوالے سے ہی کہا ہوگا کہ ''اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے'' کیونکہ فورٹ ولیم کالج کو بند کرنے کے بعد برطانیہ کی مشرقی ہندوستانی کمپنی کو آخر کار 1837 کو ایک طویل مدت بعد اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دینے کا خیال آیا اور اسی سال سے دلی کالج کی سرگرمیوں نے بھی عروج حاصل کیا، حالانکہ دلی تا پالم والی سلطنت کا آفتاب غروب ہو رہا تھا، بلکہ ہو چُکا تھا، استعماری قوتیں نو آبادیاتی نظام کی شکل میں اپنے قدم جما چکے تھے۔غالب ان سب واقعات کے چشم دید گواہ تھے۔قدیم دلی کالج کی جدید تعلیم سے نئی نسل ایک نئے خواب کی تعبیر بُننے لگی تھی۔(10/9/8/7/6)

غالب کے انتقال کے تقریباً آٹھ سال بعد اقبال 9 نومبر 1877ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔غالب کی طرح اقبال نے بھی جس زمانے میں ہوش سنبھالا، وہ بھی تاریخ کے اعتبار سے تبدیلیوں کا زمانہ تصور کیا جاتا ہے۔اقبال کی پیدائش اٹھارویں صدی کے ربع آخر میں ہوئی اور ہوش سنبھالنے تک زمانہ ڈگمگانے لگا تھا۔ماضی اور مستقبل یا روایت اور جدت کے درمیان جنگ شروع ہو چکی تھی۔جمال الدین افغانی، شاہ ولی ا؟ دہلوی، محمد بن عبدالوہاب، کارل مارکس، نٹشے، غالب، حالی، سرسید احمد خان، شبلی نعمانی، راجہ رام موہن رائے، گوئٹے، فرائڈ، نیوٹن، ڈارون وغیرہ جیسے مجدّد، مفکر، سائنس دان پیدا ہو چکے تھے۔اقبال نے جہاں ان مفکروں اور دانشوروں کا بغور مطالعہ کیا، وہیں انقلاب روس اور انقلاب چین یا پھر کمال مصطفٰے اتاترک کی جدید تُرکی کو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا اور یہ مشاہدہ کیا کہ دنیا کیسے کروٹیں بدلتی رہتی ہے۔تاہم یہ بھی یاد رہے کہ اقبال کا مطالعہ یا فکری ماخذ صرف اپنے دور کے مفکروں اور انقلابات پر ہی مشتمل نہیں ہے، بلکہ جہاں انہوں نے اسلامی تعلیمات کا گہرا مطالعہ کیا تھا، وہیں وہ دیگر مذاہب کی تعلیمات سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔اُن کا مطالعہ اور فکری ماخذ قبل مسیح کے مفکروں جیسے سقراط، ارسطو، افلاطون وغیرہ سے لے کر اپنے زمانے کے کارل مارکس اور شبلی نعمانی تک تھا۔اُن کے فکری ماخذ مولانا روم سے لیکر کے بھرتری ہری تک پھیلے ہوئے تھے۔یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ جہاں اقبال جدت کے علمبردار تھے وہیں، اُن کے فکری ماخذ ماضی سے جڑے ہوئے تھے۔پروفیسر مشیر الحق لکھتے ہیں:

''اقبال اصلاً اسلامی مفکر تھے اور ہمیں ان کے سیاسی خیالات میں عصریت کی روح کو تلاش
کرتے وقت اس بات کو ذہن مین رکھنا پڑے گا کہ ان کی عصریت ماضی سے قطع تعلق پر
نہیں، بلکہ اس کی بنیادوں پر قائم تھی۔''11

علامہ اقبال کے خیالات میں جب بھی نئی دنیا کو تلاش کیا جائے، اُس وقت اقبال کی نئی دنیا روایت سے انحراف نہیں کرتی، بلکہ اُس کی یہ دنیا ماضی کی بنیادوں پر ہی قائم ہے یا پھر روایت کی تجدید ہے، جو ایک بڑے مفکر کی ایک بڑی نشانی ہے۔اقبال کی شاعری اور نثری تحریروں

میں جہاں اسلامی مفکروں اور دانشوروں کا ذکر اکثر و بیشتر ملتا ہے، وہاں وہ غیر مسلم مفکروں اور دانشوروں سے بھی مستفید ہونے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ اقبال صرف موجودہ سائنسی انقلابات سے ہی استفادہ کرنے کی تلقین نہیں کرتے، بلکہ وہ رومی، سنائی، عطار، ابن خلدون، ابن ہشام، ابوبکر محمد بن ذکریا رازی، ابن سینا، ابن رشد، ارسطو، افلاطون، البیرونی، بقراط وغیرہ جیسے مفکروں اور دانشوروں سے بھی استفادہ کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ گویا اقبال ایک ایسے مفکر اور دانشور تھے جنہوں نے اپنی بصیرت کے ذریعے ماضی کی روشنیوں کو حال اور مستقبل میں اس طریقے سے پیش کیا کہ وہ قدیم ہونے کے باوجود جدید ثابت ہوئے اور ہمیں ان روشنیوں کی ضرورت عصری مسائل میں صاف نظر آنے لگی۔ پروفیسر مشیر الحق اپنے مضمون میں آگے چل کر رقم طراز ہیں:

> ''ماڈرن مسلم مفکر کی تعریف جو ہم نے کی ہے، اُس کی رُو سے ضروری ہے کہ وہ ماضی کے اُجالے میں مستقبل کی طرف قدم اُٹھائے۔ جہاں تک اقبال کا سوال ہے، وہ اس معیار پر پورے اترتے ہیں۔''12

اقبال کی فکر اسی آویزش و آمیزش کی ایک زندہ مثال ہے۔ انہوں نے کبھی روایت سے انحراف نہیں کیا یا پھر نئے کو ہی گلے نہیں لگایا، بلکہ انہوں نے مستقبل کی تعمیر روایت کی بنیادوں پر ہی قائم کی۔ اقبال جدید ذہن کے معمار بھی ہیں اور ان کی فکر میں قدیم روایت کا تسلسل بھی ہے اور اقبال خود اس کی گواہی ذیل کے شعر میں یوں پیش کرتے ہیں:

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصہ قدیم و جدید

اس سچائی سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُن کے افکار و خیالات میں بیداری اور تحرک ہے۔ یہی اُن کی عظمت ہے اور اسی وجہ سے وہ جدید سمجھے جاتے ہیں، بلکہ اس معاملہ میں قدیم و جدید کا قصہ اُن کے سامنے دلیل کم نظری ہے اور اس کی آمیزش و آویزش وسعت نظری۔ وہ جمود سے نفرت اور حرکت سے محبت کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی تمام تخلیقات تغیر کا تصور دیتی ہیں۔ ان کے نزدیک عمل پیہم ہی انسان کو فاتح عالم بنا سکتا ہے۔ اقبال ایسا عمل چاہتے ہیں، جو ہر قسم کی بندش سے آزاد ہو۔ اُن کے نزدیک قدیم، جدید کے لئے سر چشمہ وجدان بن جاتا ہے۔ انہیں اس بات سے اتفاق نہیں کہ ماضی ہماری عقل کو مفلوج کر دے گا یا اس سے جمود طاری ہو جائے گا، بلکہ یادِ عہد رفتہ اُن کی خاک کیلئے اکسیر کا کام کرتی ہے۔

یادِ عہد رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے
میرا ماضی میرے استقبال کی تصویر ہے

اقبال ماضی سے استفادہ کرنے کی تلقین ضرور کرتے ہیں لیکن ماضی میں غروب ہو جانے سے منع کرتے ہیں۔ انہوں نے ہندوستان سے

ہسپانیہ تک ہر ملک کا چشمِ باطن سے مشاہدہ کیا ہے۔ وہ مسجد قرطبہ کی غزل خوانی اسی لئے کرتے ہیں تا کہ ملت اسلامیہ اپنی عظمتِ رفتہ حکومت اور کارناموں کو دیکھ کر جاگ جائیں اور اپنی تعمیر کیلئے از سرِ نو تیار ہو جائیں۔ غالب کی طرح اقبال کا مطالعہِ سماجی علوم اور جغرفیہ وسیع وعریض ہیں، جہاں وہ زمانے کے ساتھ چلنے کی ترغیب دیتے ہیں، وہیں اُس میں اپنے اسلاف کی طرح سر اُٹھا کر چلنے کی کا سلیقہ بھی سیکھاتے نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی لکھتے ہیں:

> ''غالب اور اقبال کا مطالعہ کرتے وقت بہت سی باتیں مشترکہ نظر آتی ہیں۔ غالب بھی انگریزی تسلط پر کڑھتے تھے، مگر پُرانے دِنوں کو یاد کرتے تھے اور روتے تھے، لیکن دشمن کو اس کے بہتر قانون اور سائنسی ترقی کی وجہ سے اس وقت تک نا قابلِ استیصال سمجھتے تھے، جب تک بعنیہ انہی صِفات سے مزیّن ہو کر ان کا مقابلہ نہ کیا جائے۔ غالب آدھے مسلمان سہی لیکن جامع مسجد دہلی میں سکھ فوجیوں کے گھوڑوں کی ہنہناہٹیں سُن کر ان کے دل میں اُن اذانوں کی تڑپ پیدا ہوتی ہیں، جو وہ اَمن کے دور میں ایک کان سے سُن کر دوسرے کان سے اُڑا دیتے تھے اور وہاں دارالاسلام قائم کرنے کے لئے اَودھ کے مجاہدین کی رنجیت سنگھی فوجیوں پر یلغار کو مردِ مومن کا کلمتہ الحق تصور کرتے تھے۔ اپنی قوم کی پامالی کو روکنے کے لئے اقبال نے بھی کلمتہ الحق بلند کیا۔ اقبال کی آواز کے پیچھے غالب کی آواز تھی۔''13

غالب کو اپنے کلمتہ الحق پر بھرپور بھروسہ تھا، وہ شعر وشاعری اور نثر میں اب نئی اور وضع دار مسائل کی اور توجہ مرکوز کرنا چاہتے تھے، اب غالب کی جدت طبع کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جب سرسید احمد خان نے ''آئین اکبری'' ترتیب وتصحیح کی اور اس پر حواشی کے اضافے کے بعد اسے دوبارہ شائع کرنے کا ارادہ کیا اور اس کے لیے انہوں مرزا غالب سے اس پر تقریظ لکھنے کی درخواست کی، اس بابت سرسید کا شاید یہ خیال تھا کہ غالب اس کارنامے پر دیگر قدامت پرستوں اور چالباز انگریزوں کی طرح انہیں شاباشی دیں گے، لیکن غالب نے اس کے برعکس اپنی تقریظ میں ایک الگ ہی پیغام بھیجا اور وہ کچھ لکھ دیا جو اس زمانے کے مسلمانوں نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔ دراصل عہد غالب میں ہندوستان تہذیبی اعتبار سے نئی تقدیر لکھنے جا رہا تھا یہ تقدیر سازی آپ کو زندگی کے ہر شعبے میں صاف نظر آئے گی، اس زمانے میں ہندوستان میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ حصہ کلکتہ تھا اور غالب کو وظیفے کے سلسلے میں کلکتہ کا سفر کرنا پڑا اور کلکتہ کے اس سفر نے غالب کی ایک الگ تقدیر لکھ دی۔ غالب نے اس صورت حال کا بغائر مطالعہ کرنے کے بعد ایک الگ تصور پیش کیا یعنی روایات کے ساتھ ساتھ متبادل اور کارآمد نظام جمال سے ایک نئی جمالیات کا آغاز۔ جیسا کہ ذکر ہوا کہ غالب کا کلکتہ کا سفر، ان کی زندگی میں ایک نئے اور معنی خیز موڑ کا سبب بنا، وہاں سے لوٹنے کے بعد غالب کا ذہنی سفر اور بھی نمایاں ہونے لگا جس کے بارے میں جمیل جالبی اس طرح رقم

طراز ہیں:

''غالب کا واسطہ انگریزوں کے ساتھ بچپن سے رہا تھا اور چونکہ وہ آزاد و غیر متعصب تھے، اس لئے جب کلکتہ گئے تو وہاں ''خوبان کشور لندن'' بھی دیکھیں اور ''بادہ ہائے ناب'' کا مزہ بھی چکھا۔ کلکتہ میں جدید دور کا آغاز ہو چکا تھا اور یہاں کا ماحول دلی کے ماحول سے مختلف تھا۔ غالب کے ذہن پر ان خیالات نے گہرا اثر ڈالا۔ مغلیہ سلطنت کا تماشا ان کے سامنے تھا، یہ سب چیزیں ان کے مزاج کا ایک حصہ تھیں۔''22

حالانکہ اس سے پہلے بھی غالب کے شاعری میں فکری گہرائی اور لسانیاتی تنوع کی آمیزش واضح نظر آتی ہے۔ لیکن ان کی شاعری میں جو فکری گہرائی ہے وہ انہیں دیگر شعراء سے قدرے منفرد بنانے میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ آہستہ آہستہ غالب کے تخیل نے ایسی پرواز کی شروعات کی کہ نئے نئے موضوعات سامنے آنے لگے، جن میں ایک نیا اور انوکھا موضوع اختلاف عہد کا شعور بھی ہے۔ جو غالب کے یہاں روایتی انداز میں نئے اور حسین لسانی لباس میں گہرے جذبات اور احساسات میں ڈھل کر ادبی چاشنی میں فکر کی ایک دستک دے رہی ہے۔ اپنے ایک خط میں میر مہدی مجروح کو لکھ رہے ہیں اب کے موضوعات کو بدلنا ضروری بن جاتا ہے اگر ہمیں ترقی کی راہ اپنانی ہے۔ لکھتے ہیں:

''میاں! کس حال میں ہو کس خیال میں ہو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مجتہد العصر سلطان العلما مولانا سرفراز حسین کو میری دعا کہنا اور کہنا حضرت ہم تم کو دعا کہیں اور تم ہم کو دعا دو۔ میاں کس قصے میں پھنسا ہے؟ فقہ پڑھ کر کیا کرے گا۔ طب و نجوم و ہیت و منطق، فلسفہ پڑھ جو آدمی بننا چاہے۔۔۔۔۔''23

غالب بذریعہ میر مہدی مجروح مولانا صاحب کو بھی پیغام دینا چاہتے ہیں کہ مجتہد العصر کے لئے لازمی ہے کہ زمانے کی باریکیوں سے باخبر رہے تاکہ لوگوں کی صحیح رہنمائی ہو۔ یہی حال اقبال کا بھی ہے اُنہیں بھی شاعری میں اظہار کی آزادی کچھ کم ہی نظر آئی اور دل کی باتوں کی وضاحت کے لئے اُنہوں نے بھی نثر کا سہارا لیا، وہ بھی زبان غیر میں تاکہ عتاب زمانہ سے محفوظ رہا جائے، یوں سات خطبات کا مجموعہ جو دراصل تفسیر نو یا ایک طرح کا نشاۃ ثانیہ ہے، انہوں نے دسمبر 1927ء اور جنوری 1929ء کے درمیان مدراس، حیدرآباد، اور علی گڑھ میں پڑھے لکھے روشن خیال مسلم ذہن تک پہنچانے کے لیے تیار کئے تھے۔ اقبال کی نظر میں ان مباحث کا مقصد اسلامی فکر و فقہ کی علمی بنیادوں کا دوبارہ جائزہ لینا چاہیے اور ساتھ میں ان باتوں کو سمجھانے کی کوشش کی گئی کہ زمانہ مسلسل تبدیلیوں کی اور گامزن ہے، ان تبدیلیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مسلمانوں کو ان تبدیلیوں سے ہم آہنگ ہو کر اور سائنسی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے اسلامی الٰہیات میں مسلسل ارتقاء اور

تشکیلِ جدید کے امکانات تلاش کرنے ہوں گے۔ غالب ہو یا اقبال یا پھر سرسید یہ سب لوگ مسلمانوں کے قدامت پسندانہ رویہ کے معترض تھے۔ انہوں نے اسلام میں مذہبی فکر سے جمودی فضا کو دور کرنے کے لئے اپنی اپنی سطح پر اور اپنے اپنے انداز میں کئی اقدامات کرنے کی کوششیں کیں۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی لکھتے ہیں:

> ''۔۔۔اقبال کی آواز کے پیچھے غالب کی آواز تھی۔ غالب شاہ عبدالعزیز کے تتبع میں انگریزی تعلیم کے اسی وقت سے حامی تھے جب ۱۸۶۴ئمیں دہلی کالج کا سنگ بنیاد رکھا گیا، لیکن سرسید کے 'آئین اکبری' کے تصیح شدہ نسخے کی تقریظ میں فرنگی علم اور ٹیکنالوجی کی شان میں مداح سرائی ہی کا اثر تھا کہ مسلمانوں میں قائداعظم، اقبال، مولانا محمد علی جوہر، ظفر علی خان، سرامیر علی، سرعلی امام، سرشاہ سلیمان، سرراس مسعود، ذاکر حسین اور حسرت موہانی جیسے رہنما؟ں کی آمد ممکن ہوئی، جنہوں نے مشرقی اور مغربی علوم سے بہرہ ور ہوکر تعلیم اور سیاست کے شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دینے کے لئے انتھک جدوجہد کی۔''24

غالب اور اقبال نے اپنی شاعری میں انسانی زندگی اور جذبات کے گونا گوں گوشوں کو وا کیا ہے۔ جہاں باقی ماندہ موضوعات کے گیت گائے گئے، وہیں محبوب کے حسن کے ساتھ ساتھ کائنات کے جمال پر بھی غالب اور اقبال نے بڑی خوبصورتی سے شاعرانہ نظر ڈالی ہے۔ چونکہ دونوں شاعر لسانی نقطہ نظر سے اردو کے علاوہ فارسی سے ہوتے ہوئے عربی زبان وادب پر بھی گہری نگاہ رکھتے تھے، اس طرح ان کی شاعری میں لفظیات کی نئی کہکشاں در آئی ہے، دونوں شعرا نے غزل کی زمین کو ہی پسند کیا ہے اور غزل کا فن رمز وایما کا فن ہوتا ہے اس لئے اس فن کے ذریعے اظہار و بیان اور بھی وضاحت طلب ہے اور جب گل وبلبُل کی روایتی شعری دنیا سے نکل کر ایک الگ اور جداگانہ موضوع کو موضوعِ گفتگو بنانا ہو تو ایسے حالات میں ظفر کے اس مصرعے ''بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی'' کے مترادف سماع بن جاتا ہے۔ اس لیے غالب اور اقبال کی شاعری میں ایک الگ ہی جمالیاتی حِس اور حسن کا ایسا چراغاں ہوا ہے جس کی مثال خصوصاً اردو شاعری کی تاریخ میں ملنا دشوار ہے، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں نئے اور اَن چھوے موضوعات کو بھی بڑی ہنرمندی سے برتا ہے کہ کہیں بھی ایسا محسوس ہوتا نظر نہیں آتا ہے کہ ان معروضی موضوعات نے ادب کی خوبصورتی کو کرکرا کیا ہ بلکہ اس کے برعکس اِن کی تخلیقی ہنرمندی اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ شاعری کا ایک منفرد دبستان وجود میں آیا ہے جس نے اردو شاعری میں ایک نئے کلامئے کی بنیاد ڈالنے میں راہیں ہموار کی ہیں۔

ماخذات:

1۔ گوپی چند نارنگ، دیباچہ، غالب معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، 2013، ص 31۔
2۔ پروفیسر یوسف حسین خان، ہیت و اسلوب کی تخلیقی توانائی، غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات، غالب اکادمی، دہلی، اپریل۔1979ء، ص ص 25، 21، 20۔
3۔ پروفیسر وارث کرمانی، شعری وراثت، غالب کی فارسی شاعری، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، 2007ء، ص 21۔
4۔ مقالہ نگار نے غالب کی یہ دلیل پیش کرنے کے لئے ''غالب نامہ''، جلد 19، شمار 2، جولائی 1998ء کے پہلے مضمون ''نئی روایت کی تشکیل کا ابتدائی عہد''، مصنف، صدیق الرحمٰن قدوائی، ص ص 10 اور 11 سے بھی خاصا استفادہ کیا ہے۔
5۔ تلاش غالب، ص 340۔
6۔ ڈاکٹر محمد حسن، غالب اور عہدِ غالب، غالب نامہ، جولائی 1981ء، ص 113
7۔ پروفیسر یوسف حسین خان، غالب اور آہنگِ غالب، غالب اکادمی، دہلی 1971ء، ص 32۔
8۔ پروفیسر حامدی کاشمیری، غالب کے تخلیقی سرچشمے، ص ص 125 تا 135۔
9۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی، غالب و اقبال: ایک تقابلی مطالعہ، غالب اور آج کا شعور، ایم۔آر۔پبلی کیشنز، نئی دہلی، 2006ء، ص ص 65 تا 66۔
10۔ نئی تنقید، (مرتب: خاور جمیل)، ص 245۔
11۔ جدیدیت اور اقبال، (مرتب: پروفیسر آل احمد سرور)، ص 49۔
12۔ جدیدیت اور اقبال، (مرتب: پروفیسر آل احمد سرور)، ص 49۔۔
13۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی، غالب و اقبال: ایک تقابلی مطالعہ، غالب اور آج کا شعور، ایم۔آر۔پبلی کیشنز، نئی دہلی، 2006ء، ص 67۔
14۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، افکارِ غالب، مکتبہ معین الادب، اردو بازار، لاہور، 1954ء، ص ص 14 تا 15۔
15۔ نئی تنقید، (مرتب، خاور جمیل)، ص 217۔
16۔ سورج، لاہور، دوصد سالہ جشن غالب، مدیر (تسلیم احمد تصور)، ص 136۔
17۔ سورج، لاہور، دوصد سالہ جشن غالب، مدیر (تسلیم احمد تصور)، ص 137۔
18۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری، ہم عصر سماجی و تہذیبی مسائل کا ادراک اور غالب، انتخاب مقالات غالب نامہ: (تنقیدات)، مرتب پروفیسر نذیر احمد، ص 395۔

19۔ نامہ ہائے فارسی غالب، مرتب (سید اکبر علی ترمذی)، ص25۔
20۔ نامہ ہائے فارسی غالب، مرتب: سید اکبر علی ترمذی، ص45۔
21۔ نامہ ہائے فارسی غالب، مرتب: سید اکبر علی ترمذی، ص54۔
22۔ پنج آہنگ (عکسی)، مرتب: کالی داس گپتا رضا، ص311۔
23۔ غالب کے خطوط، جلد دوم، میر مہدی مجروح، خط: 34، مرتبہ: خلیق انجم، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، 2006ء، ص527۔
24۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی، غالب و اقبال: ایک تقابلی مطالعہ، غالب اور آج کا شعور، ایم۔آر۔ پبلی کیشنز، نئی دہلی، 2006ء، ص 67۔

رابطہ:
ڈاکٹر عرفان عالم
ایسوسیٹ پروفیسر، شعبہ اردو
سنٹرل یونیورسٹی آف کشمیر، گاندربل
irfanaalam@yahoo.com